عہد وسطیٰ کا ہندوستان عرب مورخین کی نظر میں

—— پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

دسویں صدی عیسوی سے عرب فضلاء نے دنیا کے مختلف ممالک کی تاریخ اور جغرافیائی حالات میں دلچسپی لینی شروع کی اور اُن پر اپنی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ نتیجہ میں بہت سی تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں جو کہ دورِ حاضرہ کے محققین کے لیے بڑی اہمیت کی حامل تصور کی جاتی ہیں۔ ان تالیفات میں ہم کو دنیا کے ممالک اور ان میں رہنے والے لوگوں کے تمدن، مذہب کے بارے میں دلچسپ معلومات ملتی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف شہروں، قصبوں اور ان کے جغرافیائی حالات کے متعلق بھی بہت اہم مواد مہیا کیا گیا ہے۔ ان میں وہ ممالک بھی شامل ہیں جن کو عربوں نے فتح کیا تھا۔ دوسرے وہ ممالک ہیں کہ جن سے عربوں کے تجارتی تعلقات تھے۔ ان ممالک میں وہ اپنی بحری اور برّی تجارت کے سلسلے میں جاتے تھے۔ چونکہ سمندری اور برّی تجارت پر مسلمان تجار نے اپنی برتری حاصل کر لی تھی اور اُن کے ذریعہ یہ بین الاقوامی تجارت مختلف ممالک میں صنعت وحرفت کے فروغ کے لیے ذریعہ اور حکمرانوں کی آمدنی میں اضافہ کا وسیلہ تھی لہٰذا غیر مسلم حکمرانوں نے مسلم تجار کو پوری مذہبی آزادی بھی دوسری سہولتوں کے ساتھ دی تھی۔ مسلمانوں نے وہاں تجارتی مراکز اور خصوصاً بندرگاہوں میں اپنی رہائشی مکانات، کارخانہ اور مساجد بھی تعمیر کر لی تھیں اور وہاں یا تو غلام خرید کر یا پھر پس ماندہ طبقہ کے لوگوں میں تبلیغ اسلام کے ذریعہ مسلمان بھی بنائے تھے۔ ایشیا کے کچھ اہم ممالک سے اس طرح اسلامی دنیا کا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ عرب سیاحوں کی اور مورخین کی کتابوں میں اس تعلق کا ذکر خاصی تفصیل سے ملتا ہے۔

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان سے متعلق عرب مورخین اور سیاحوں میں سلیمان تاجر، کتاب المسالک والممالک کے مولف ابوالقاسم عبیداللہ بن خردادبہ اور مروج الذہب کے مولف المسعودی

قابل ذکر ہیں۔ ان کا تعلق دسویں صدی عیسوی سے ہے۔ انھوں نے اپنے زمانہ کے ہندوستان کے بارے میں اہم معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ المسعودی نے چشم دید واقعات بیان کیے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے مغربی کونکنی ساحل پر مسلم تجار کی بستیاں، ان کی بود وباش اور ہندوستان اور دوسرے ممالک سے تجارت کا بیان دلچسپ ہے۔ اِن مولفین کی نگارشات سے متاثر ہو کر ان کے پیشروؤں نے دنیا کے ممالک، لوگوں اور اُن کے طور طریقوں پر مزید تحقیق کرکے اسلاف کی روایت کو آگے بڑھایا۔ لہٰذا گیارہویں صدی عیسوی کے مسلم دانشوروں کی تحقیقات میں مختلف ممالک کو ایک دوسرے سے منسلک کرنے والے بحری اور بری راستوں، وہاں کے جغرافیائی حالات اور ثقافت پر مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرکے عربی لٹریچر میں گرانقدر اضافہ کیا۔ اِن مسلم دانشوروں میں ابوریحان البیرونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ انھوں نے ازسرِنو سائنٹفک تحقیق کے ذریعہ اپنی تالیفات "نہایت الاماکین اور" قانون مسعودی" میں شہروں کے صحیح طول البلد اور عرض البلد کا تعین کیا۔

البیرونی کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں شامی فضلا جن کو مصر کے مملوک سلاطین کی سرپرستی حاصل تھی انھوں نے بھی دنیا کے مختلف ممالک پر اہم کتابیں لکھیں اور پرانے لٹریچر سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تالیفات کو اپنے عہد تک کے حالات کے بیان پر ختم کیا۔ ان دانشوروں میں تقویم البلدان کے مولف ابو الفدا اور مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے مولف شہاب الدین العمری کے علمی کارنامے بہت اہم ہیں۔ ذیل کی سطور میں ہم تقویم البلدان کے سندھ اور ہند کے باب کی تاریخی اہمیت کا تجزیہ پیش کریں گے۔ جہاں جہاں ممکن ہو سکا ہے وہاں معاصر ماخذ سے مقابلہ کیا گیا ہے۔

ابو الفدا کے حالات زندگی کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کیونکہ کسی بھی دانشور یا ادیب یا مورخ کے خاندانی ماحول، ملکی ثقافت اور اس کے روزگار کا اس کے اسلوب تحریر اور تاریخی عوامل کے تجزیہ کے عمل (approach) پر کافی اثر پڑتا ہے۔ ابو الفدا کا خاندان شام میں حکمراں طبقہ سے متعلق تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں منگولوں کے حملہ کے وقت ان کے والد شام سے مصر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کیونکہ مصر منگولوں کی یورش سے باہر تصور کیا جاتا تھا۔ مصر کے مملوک سلاطین کے شام کے کامیاب دفاع کرنے پر دوبارہ وہ اپنے وطن مالوف واپس آ گئے اپنے باپ اور چچا کی طرح ابو الفدا

بھی شام میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ سیاسی اور سرکاری مشغولیات کے باوجود علمی مشاغل کو بھی جاری رکھا۔ اہم علمی موضوعات مثلاً فقہ، طب، تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق علوم پر کتابیں تصنیف کیں۔ ان کتابوں میں تقویم البلدان جو کہ مختلف ممالک کی تاریخ اور جغرافیائی حالات کے بارے میں ہے اُن کا علمی شاہکار تصور کیا جاتا ہے[۲۱]۔ اس کی تکمیل میں ابوالفدار نے عربی زبان میں دستیاب قدیم تالیفات سے استفادہ کرنے کے علاوہ اپنے معاصر سیاحوں سے معلومات حاصل کر کے شامل کیں اور ۱۳۲۱ء کے بعد اسے شائع کیا۔ یہاں اس کا تذکرہ ضروری ہے کہ جہاں ہندوستانی شہروں کا ذکر معاصر سیاحوں کی اطلاع پر ہوا ہے وہ حصہ یقیناً اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اُس سے ہمارے ہندوستانی معاصر فارسی ماخذ میں موجود تاریخی مواد میں دلچسپ اضافہ ہوتا ہے لیکن زیر مطالعہ کتاب تقویم البلدان میں اس طرح کا مواد کم ہے۔

کتاب کے سندھ اور ہند کے عنوان سے متعلق باب کا آغاز ابن حوقل کے حوالہ سے ہوتا ہے جس کے مطابق سندھ کا خطہ[۲۲] ایران کی ولایت کرمان کی مشرقی سرحد سے ملحق ہے اور جنوب میں سمندر (بحر عرب) سے جا ملتا ہے۔ یہ سمندر ریگستان کے جنوب میں واقع ہے۔ پھر شمال اور مشرق میں مکران کی سرحد ہندوستان سے ملتی ہے پھر بتاتے ہیں کہ مکران کے وہ حصے جو خطہ سندھ میں شامل کر لیے گئے ہیں وہ توران اور بدھیہ کے نام سے موسوم ہوتے ہیں۔ توران مکران کا شمال مشرقی علاقہ ہے جس کا مرکزی شہر قصدار ہے (موجودہ قلات میں خوضدار تصور کیا جاتا ہے) جبکہ بودھیہ موجودہ کچھ گونڈوانہ کا علاقہ ہے۔

خطہ مکران کا احوال قدیم عربی لٹریچر پر مبنی ہے۔ جس میں مکران ایک خوشحال اور تجار سے آباد خطہ بتایا گیا ہے۔ کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے عرب ممالک سے ایران آتے تھے اور پھر وہاں سے مکران ہوتے ہوئے وسط ایشیا، چین اور ہندوستان آتے تھے اور پھر اسی راستہ سے واپس ہوتے تھے لہٰذا جہاں پانی دستیاب تھا اور حالات انسانی زندگی کے لیے دشوار نہیں تھے وہاں چھوٹی بڑی بستیاں آباد ہو گئی تھیں جہاں عرب تجار یا ان سے متعلق لوگ قافلوں کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے آباد ہو گئے تھے۔ لیکن تیرہویں صدی عیسوی میں ۱۲۲۲ء کے بعد منگولوں کی یورش کی وجہ سے مکران تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ عربوں کے قائم کردہ تجارتی مراکز نیست و نابود ہو گئے تھے۔ صرف خانہ بدوش افغان اور بلوچ باقی رہ گئے تھے۔ مکران کا مقامی حکمران خاندان جس کا آخری فرمانروا سلطان

تاج الدین ابوالمکارم تھا اور جو کہ شعرا اور فضلا کا مربی اور علم و ہنر کا قدر دان تھا وہ بھی صفحۂ ہستی سے غائب ہوگیا تھا[۱۳]۔ لیکن ابوالفدار نے منگولوں کی تاخت و تاراج کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح خطۂ سندھ کے بھی اُن شہروں کا ذکر ملتا ہے جو کہ مولف کے اپنے عہد میں دریائے سندھ کے رُخ بدلنے کی وجہ سے بالکل اُجڑ گئے تھے اور صرف اُن کے کھنڈرات مل سکتے تھے۔ لیکن عرب حکمرانوں کے عہد میں وہاں بڑے اہم شہر تھے اور ان کو عربوں نے تعمیر کیا تھا۔ مولف کے اپنے زمانہ (کے یعنی تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی) کے شہروں کا ذکر بالکل نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر سندھ کے مشہور شہر منصورہ کے بارے میں کافی تفصیل ملتی ہے جبکہ وہ ویران ہوگیا تھا اور اس کے کھنڈرات موجودہ شہر حیدرآباد (سندھ) سے کچھ فاصلہ پر ملتے ہیں[۱۴]۔ منصورہ کے عدم وجود کا ابوالفدار کو علم بھی تھا کیونکہ وہ بیان کرتے ہیں کہ عرب فاتحین نے مفتوحہ ممالک میں اپنی شاندار فتوحات کی یاد میں منصورہ نام کے شہر آباد کیے تھے۔ لیکن (اُن کے اپنے زمانہ میں) مصر کے المنصورہ شہر کے علاوہ سب ہی صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئے۔ سندھ کا قدیم مرکزی شہر جو کہ داہر کا پایہ تخت تھا اور موجودہ روہڑی قصبہ سے کچھ فاصلہ پر واقع تھا اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ شہر آبادی اور وسعت میں شہر ملتان کا ہم پلہ ہے جبکہ ارور کا وجود نہیں رہا تھا[۱۵]۔ دیبل جو کہ تیرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں بندرگاہ نہیں رہا تھا اس کے بارے میں بھی قدیم عربی مآخذ کی بنا پر لکھتے ہیں کہ دیبل چھوٹا سا شہر ہے۔ آب و ہوا گرم ہے۔ یہاں سرسوں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کھجور بصرہ سے درآمد ہوتے ہیں لیکن دیبل بندرگاہ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ مزید برآں لکھتے ہیں کہ دیبل اور منصورہ کے درمیان سفر کے سلسلے میں چھ منازل کو طے کرنا پڑتا ہے۔ درحقیقت اس زمانہ میں نہ منصورہ رہا تھا اور نہ ہی دیبل۔ برخلاف ابوالفدار کے اُن کا معاصر سیاح ابن بطوطہ جو کہ ۱۳۳۳ء میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے سندھ کی سیر کی تھی وہ دیبل کی بجائے سندھ کے نئے بندرگاہ موسوم بہ لاہری بندر کا ذکر کرتا ہے۔ ابن بطوطہ کے مطابق لاہری شہر بہت خوبصورت سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس کے پاس دریائے سندھ سمندر میں گرتا ہے۔ یہ شہر بڑا بندرگاہ ہے۔ یمن اور فارس کے جہاز اور تاجر بہت آتے ہیں اور اس لیے یہ شہر نہایت مالدار ہے اور اس کا محاصل بھی زیادہ ہے[۱۶]۔"

جہاں تک پنجاب کے قدیم شہر ملتان کا احوال ہے وہ بھی قدیم لٹریچر پر مبنی ہے۔

اور اُس سے مولف کے اپنے عہد یعنی چودھویں صدی کے ملتان کے بارے میں علم نہیں ہو پاتا۔ ابوالفدا ، ملتان کے قدیم مندر کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جیسے اُن کے زمانہ میں موجود تھا حالانکہ اس مندر کو دسویں صدی کے اخیر میں عربوں سے حکومت چھیننے کے بعد اسماعیلی فرقہ کے شیعہ حکمراں نے منہدم کر دیا تھا۔ لیکن بلاذری کی فتوح البلدان اور اُن کے بعد کے مورخین اور سیاحوں کی کتابوں کی بناپر رقمطراز ہیں کہ ملتان کے عظیم الشان مندر کے اندر ایک بُت ڈائس پر بیٹھا ہوا ہے جس کی شبیہ انسان کی طرح ہے۔ یہ پلوتھ مارے ہوئے ہے اور اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں میں ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی زیارت کے لیے زائرین ہندوستان کے دور دراز حصّوں سے آتے ہیں۔ سونا چاندی چڑھانے کے علاوہ عود کی قیمتی لکڑی بھی نذر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس نذر میں ملتان کے حکمران کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ حکمراں مسلمان ہے۔

سندھ اور ملتان کے بعد ہندوستان کے دوسرے علاقوں کا ذکر آتا ہے۔ یہ حصہ بھی زیادہ تر قدیم عربی کتابوں پر مبنی ہے لیکن چند شہروں کے متعلق مولف نے اپنے معاصر سیّاحوں سے حاصل کی ہوئی تفصیلات درج کر دی ہیں۔ تیرہویں صدی میں ان شہروں کی کیفیت کے سلسلے میں تفصیلات دلچسپ ہیں۔ مثلاً راجپوتانہ کے دو اہم شہروں کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ناگور کا سفر دلی سے چار دن کے عرصہ میں طے ہوتا ہے۔ ناگور کے بعد جالور کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ اونچے ٹیلے پر واقع ہے اور مصر کے شہر مصاف کی مانند ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ جالور گجرات کے شہر نہلوارہ اور ناتور کے درمیان ہے۔ جنوبی ہندوستان کے تذکرہ میں سیاہ مرچ کی کاشت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُس کے پودے بیلوں کی طرح پیڑ پر چڑھ جاتے ہیں۔

گجرات کے شہروں میں صرف کھنبایت کا ذکر سیاحوں کی رپورٹ پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے گجراتی شہروں کو قدیم لٹریچر کی بناپر بیان کیا ہے۔ مثلاً جزیرہ دیو (DIU) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ کھنبایت کے سامنے خلیج فارس میں جزیرہ ہے۔ یہاں کے باشندے سمندری قزاق ہیں اور بانس سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ حالانکہ چودھویں صدی میں گجرات دہلی سلطنت کا حصہ ہو گیا تھا اور اس سے متعلق جزیرے اور بندرگاہ سلطان دہلی کی قلمرو میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر جگہ امن و امان قایم ہو گیا تھا۔ بیرونی تجار کو مکمل تحفظ حاصل ہونے

کی وجہ سے بیرونی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ اسی طرح سومنات کا ذکر البیرونی کی مشہور کتاب القانون المسعودی کے حوالہ سے شروع ہوتا ہے کہ سومنات گجرات کے ساحل پر کاٹھیاوار کے علاقہ میں واقع ہے۔ عدن کی طرف جانے والے جہاز یہاں سے ہو کر گذرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ سومنات ان شہروں میں شامل ہے جن کو سلطان محمود غزنوی نے فتح کیا تھا اور وہاں کے مشہور بت کو توڑ دیا تھا جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہوا ملتا ہے۔

گجرات کے مرکزی شہر نہلوارہ کا ذکر بھی البرونی کے حوالہ سے کیا ہے کہ اس کو نہلوالا اور نہروارہ لکھا جاتا ہے چونکہ البرونی نے اس کو نہلوارہ لکھا ہے لہٰذا یہی زیادہ صحیح ہوگا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ نہلوارہ شہر میں تالاب اور باغات کثرت سے ملتے ہیں۔ تالابوں کے اندر عمارتیں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ کھنبایت کو گجرات کا خاص بندرگاہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ایک کھاڑی میں واقع ہے اور مسلم تجار کی آماجگاہ ہے یہ ایک خوبصورت شہر ہے اور اس کی آبادی ملک شام کے شہر المعرہ سے کہیں زیادہ ہے۔ شہر میں عمارتیں پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہیں اور اس کے باشندے (زیادہ تر) مسلمان ہیں۔ یہاں پر سفید سنگ مرمر بھی دستیاب ہوتا ہے اور باغات بھی اچھے خاصے ہیں۔

مہاراشٹرا کے ساحل پر آباد شہروں کا بھی ذکر دلچسپ ہے۔ ہنور کے متعلق (یہ بمبئی کے نزدیک ہونور کہلاتا ہے اور ایک تحصیل کا صدر مقام ہے) فرماتے ہیں کہ یہ خوبصورت شہر ہے اور باغات سے گھرا ہوا ہے۔ پانی کی فراوانی ہے۔ لہٰذا زمین زرخیز ہے۔ ابن بطوطہ کے مطابق شہر ہنور ایک کھاڑی میں واقع تھا جس میں سے دنی جہازوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ابن بطوطہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ "شہر ہنور کے باشندے شافعی مذہب کے پیرو ہیں۔ وہ دیندار اور نیک بخت ہیں اور بحری طاقت کے لیے مشہور ہیں۔ اس شہر کی عورتیں اور اس پورے ساحل کی عورتیں سیا ہوا کپڑا نہیں پہنتیں بلکہ بے سلا کپڑا اوڑھتی ہیں۔ ایک آنچل سے تمام بدن لپیٹ لیتی ہیں اور دوسرے کو سر اور چھاتی پر ڈال لیتی ہیں۔ یہ عورتیں خوبصورت اور باعفت ہوتی ہیں ناک میں سونے کا بلاق پہنتی ہیں اور یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ سب کی سب حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ اس شہر میں تیرہ مکتبیں (مدرسے) لڑکیوں کی اور تیئس مکتبیں لڑکوں کی دیکھیں۔ سوا اس شہر کے یہ بات میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یہ لوگ فقط تجارت بحری سے گذارہ کرتے ہیں"۔[۲۳]

اسی طرح سے مہاراشٹرا کے شہر تھانہ کا ذکر بھی تاریخی نقطۂ نظر سے عہدِ وسطیٰ کے

ہندوستان کی تاریخ کے طالب علم اور محقق کے لیے اہم ہے۔ وہ اس کو چودھویں صدی کے آغاز پر ہندو مسلمانوں کا مخلوط شہر بتاتے ہیں۔ وہ اس کو بین الاقوامی شہرت کا بندرگاہ بھی بتاتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ تھانہ میں ہندوؤں کی اکثریت ہے جو کہ اپنے مذہب کے سچے پیرو ہیں اور بت پرستی کرتے ہیں۔ پھر البیرونی کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ وہاں بانس کے جنگلوں سے طباشیر مہیا ہوتی ہے جسے بیرونی ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے۔

سندابور (جس کو پرتگالی سیاح سنجم لکھتے ہیں اور جو ضلع تھانہ میں دمن کے جنوب میں واقع ہے) کا ذکر ایک معاصر سیاح کے حوالہ سے کرتے ہیں کہ تھانہ سے سندابور کا سفر تین دن کے عرصہ میں طے ہوتا ہے۔ یہ بحرِ عرب میں جزیرہ ہے۔ ابن بطوطہ کے مطابق سندابور جزیرے کے اندر دو شہر آباد تھے۔ ایک پرانا شہر تھا جس کو زمانہ قدیم میں ہندوؤں نے آباد کیا تھا دوسرا شہر مسلمانوں نے اپنی فتح کے بعد آباد کیا تھا۔ ابن بطوطہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں ایک عظیم جامع مسجد ہے جو کہ بغداد کی مسجدوں کے طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔[۳۵]

پنجاب کے شہروں میں جنوبی ہندوستان کے شہروں کے بعد لاہور کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو ایک عظیم شہر بتاتے ہیں۔ حالانکہ ابوالفدار کے زمانہ میں لاہور اپنی اہمیت کھو چکا تھا کیونکہ ۱۲۴۱ء میں اس کو منگول حملہ آوروں نے تباہ کر دیا تھا۔ اس تباہی کے بعد لاہور پندرہویں عیسوی کے نصف اول تک اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل نہیں کر سکا۔ پندرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں یہ لودی سلاطین کے زمانہ میں دوبارہ ایک شہر کی شکل میں ابھرا لیکن ۱۲۴۱ء سے پہلے لاہور شمالی ہندوستان کا سب سے عظیم شہر تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں غزنوی سلاطین کا پایہ تخت ہو گیا تھا کیونکہ ترکوں کا غزنی پر قبضہ ہو گیا تھا اور غزنی کے باشندے ان کے تشدّد اور لوٹ مار سے بچنے کے لیے لاہور کے لیے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں علماء اور فضلاء کے علاوہ تجار بھی تھے لہٰذا ان سب کی آمد سے لاہور تجارت، علم اور دانش کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ لاہور کی شان اور عظمت بھی تھی کہ اس کو سلطان معز الدین محمد بن سام (یعنی شہاب الدین غوری) نے اپنی فتح کے بعد ۱۱۸۱ء میں اپنا موسم سرما کا پایہ تخت بنایا۔ موسم گرما میں اس کا پایہ تخت غزنی ہی رہتا تھا؛ چونکہ اس زمانہ میں دہلی ایک چھوٹا سا قصبہ اور پرگنہ کا غیر اہم مرکز تھا لہٰذا ۱۲۰۶ء میں سلطان معز الدین محمد بن سام کے قتل کے بعد اس کے ہندوستان

میں غلام سپہ سالار ملک قطب الدین نے بھی لاہور ہی کو اپنے پایۂ تخت کے لیے منتخب کیا۔ دراصل ابوالفدار کا لاہور کے بارے میں بیان منگولوں کی تاخت سے قبل کے لاہور پر صادق آتا ہے کیونکہ وہ اس کو دولت سے پُر اور علماء اور فضلا کا مرکز بتاتے ہیں۔

شہر دِلی (دہلی) کا تذکرہ بھی تاریخی اہمیت سے خالی نہیں ہے لیکن یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ اُن کے تذکرہ دہلی کا اطلاق تیرہویں صدی عیسوی کے البارِی ترک سلاطین کی دہلی پر ہوتا ہے۔ ابوالفدار کے معاصر خلجی اور تغلق سلاطین کے عہد میں دہلی زیادہ وسیع اور خوبصورت شہر ہوگیا تھا چودھویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں پرانی دہلی کے باہر زیادہ خوشنما شہر آباد ہو گئے تھے۔ بہرحال وہ لکھتے ہیں کہ دلی ایک عظیم شہر ہے۔ اس کی شہر پناہ پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہ شہر ایک میدان میں آباد ہے لیکن زمین ریتیلی اور پتھریلی ہے۔ شہر سے ایک فرسخ (تین میل کا فاصلہ پر) ایک بڑا دریا بہتا ہے جو کہ فرات سے کچھ کم ہے۔ سیاحوں کے مطابق دلی کے زیادہ تر باشندے مسلمان ہیں اور یہاں کا حکمران بھی مسلمان ہے۔ دِلی میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی آباد ہیں۔ یہاں باغات بھی ہیں لیکن انگور کی کاشت نہیں ہوتی۔ بارش موسم گرما میں ہوتی ہے۔ دِلی سے سمندر بہت طویل فاصلہ پر ہے۔ یہاں سے نہلوارہ (گجرات) کا سفر ایک ماہ میں طے ہوتا ہے۔ پھر دِلیّ کے قطب مینار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہاں کی جامع مسجد کا منارہ اس قدر اونچا اور شاندار ہے کہ اُس کا ثانی روئے زمین پر نہیں ملتا۔ اس کے اوپر چڑھنے کے لیے اس کے اندر تین سو ساٹھ سیڑھیاں ہیں۔ اس کی اونچائی اتنی ہی زیادہ ہے کہ جتنی اسکندریہ کے روشنی کے منارے کی ہے۔"

ابوالفدار کے برعکس اُن کے معاصر اور ہم وطن شہاب الدین العمری نے اپنی تالیف "مسالک الابصار فی ممالک الامصار میں ہندوستان سے متعلق ابواب کی تکمیل کے لیے بڑی چھان بین کے ساتھ سیاحوں اور قدیم لٹریچر سے مواد اکٹھا کیا۔ لہٰذا ان کی کتاب ہمارے ہندوستانی فارسی ماخذ میں درج تاریخی مواد میں بہت اہم اضافہ کرتی ہے۔ العمری کو اطلاع بہم پہنچانے والے سیاحوں میں عرب تجار اور ہندوستانی زائرین دونوں شامل تھے۔ لہٰذا وہ ہر بات کی تصدیق مختلف ذرائع سے کرتے تھے اور جب ان کو رپورٹ کے صحیح ہونے کی پوری تصدیق ہو جاتی تھی تب اس کو ہندوستان سے متعلق باب میں

شامل کرتے تھے[۱۱] مثال کے طور پر وہ سلطان محمد بن تغلق شاہ کی دلی کے بارے میں لکھتے ہیں "میں نے شیخ مبارک سے شہر دلی اور اس کی بناوٹ اور دیگر حالات کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ کئی شہروں کا مجموعہ ہے جس کے ہر شہر کا ایک مستقل اور جانا بوجھا نام ہے لیکن عملاً دِلی کا اطلاق سارے مجموعہ پر ہونے لگا ہے۔ دِلی طول و عرض میں دور تک پھیلی ہوئی ہے اس کی آبادی کا دور چالیس میل ہے۔ عمارتیں پتھر اور اینٹ کی ہیں چھتیں لکڑی کی اور فرش مرمر جیسے ایک پتھر کے۔ دِلی کے مکان زیادہ سے زیادہ دو منزلے ہوتے ہیں۔ مرمر کا فرش صرف شاہی عمارتوں میں لگایا جاتا ہے شیخ ابو بکر بن خلّال نے کہا کہ یہ پرانی دِلی کے مکانات کا خاکہ ہے، وہاں جو نئی بستیاں وجود میں آئی ہیں اُن کے مکانوں کا انداز مختلف ہے۔ اس وقت دلی کا اطلاق اکیس شہروں پر ہوتا ہے[۱۲] یہاں باغ ایک سیدھے خط پر برابر برابر لگائے جاتے ہیں، ہر خط کی لمبائی مشرق، شمال اور جنوب میں بارہ میل ہے، غربی سمت میں باغ نہیں ہیں۔ کیونکہ ادھر (اراولی) پہاڑ کا سلسلہ ہے۔

"دِلی میں ایک ہزار اسکول ہیں، اُن میں ایک کو چھوڑ کر جہاں شافعی فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے باقی سب حنفی مذہب ہیں۔ ہسپتال لگ بھگ ستر ہیں، یہاں بیمارستان (ہسپتال) کو دارالشفاء کہتے ہیں۔

دِلی اور اُس کے ماتحت علاقوں میں دو ہزار خانقاہیں (یعنی سرائیں) ہیں۔ شہر میں بڑی بڑی عمارتیں، لمبے چوڑے بازار اور بڑی تعداد میں حمام ہیں، شہر کا سارا پانی کنوؤں سے نکالا جاتا ہے جو زیادہ گہرے نہیں ہوتے، اُن کی زیادہ سے زیادہ گہرائی چودہ فٹ ہوتی ہے۔ یہاں وہ جامع مسجد ہے جس کا منارہ اذان مشہور ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر بلندی میں اس کی نظیر نہیں"[۱۳]

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ابن بطوطہ کا سفر نامہ مسالک الابصار فی ممالک الامصار کی طرح بہت اہم ماخذ ہے۔ اس نے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ثقافت کی جو تصویر پیش کی ہے وہ گلہائے رنگا رنگ کی مانند ہے چونکہ اس کا بیان چشم دید واقعات پر مبنی ہے لہٰذا وہ مسالک الابصار اور تقویم البلدان کے مواد میں اضافہ ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی تصدیق بھی کرتا ہے۔

حواشی

۱؎ ابوالفدا (م، ۱۳۳۱ء) کی تالیف تقویم البلدان کو ایم۔ رینا د (M. Reinaud) نے ۱۸۴۰ء میں پیرس سے شائع کیا۔ اس میں مختلف ممالک کے جغرافیائی اور ثقافتی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ موجودہ مقالہ میں ہندوستان سے متعلق باب کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ تقویم البلدان کے متن کے علاوہ پروفیسر مقبول احمد کا انگریزی مقالہ جو کہ میڈیول انڈیا کوارٹرلی، علی گڑھ ۱۹۵۰ء نمبر ۳ اور ۴ میں شائع ہوا تھا سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۲؎ عہد وسطیٰ کے عربی اور فارسی لٹریچر میں خطہ ایک اصطلاح کے طور پر آتا ہے جس کے معنی ولایت یا صوبہ کے ہوتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کا مقالہ Evolution of the vilayet, the Shiqq and the Sarkar during the Delhi Sultanat Period, Medieval India, Quarterly, Aligarh nos. 1–4, 1963.

۳؎ سراجی خراسانی، دیوان سراجی خراسانی، مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۵ء ص ص۔ ۲۶۶، ۶۴۵۔ سراجی خراسانی نے مکران کے سلطان تاج الدین ابوالمکارم کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے تھے۔ منہاج سراج جوزجانی نے اپنی طبقات ناصری میں مکران کے فرمانروا کو سلطان غیاث الدین محمد بن سام کے ماتحت بتایا ہے۔ طبقات ناصری، جلد اول، کابل ۱۹۶۳ء ص ۳۶۸۔

۴؎ سندھ کی فتح کے بیس سال بعد محمد بن قاسم الثقافی کے بیٹے عمرو نے المنصورہ کو آباد کیا تھا جو کہ جلد ہی ترقی کر کے مسلم سندھ کا مرکزی شہر بن گیا تھا۔ ملاحظہ کیجئے نبی بخش بلوچ کا مقدمہ اور تبصرہ فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ میں۔ علی کوفی، فتح نامہ سندھ (عرف چچ نامہ، اسلام آباد) ۱۹۸۲، ص۔ ۲۱۔

۵؎ ارور شہر راجہ داہر کا پایہ تخت تھا اور سندھ کے کنارہ آباد تھا۔ یہ موجودہ سکّر سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ ملاحظہ کیجئے، نبی بخش بلوچ، فتحنامہ سندھ (چچ نامہ) تعلیقات انگریزی ص۔ ۸۱۔

۶؎ ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، مترجم مولوی محمد حسین، اسلام آباد، ۱۹۸۳، جلد دوم، ص ۱۷ تا ۱۸۔

۷؎ ایضاً، ص ۲۸۶ تا ۲۸۷۔

۸؎ ایضاً ص ۲۸۴ تا ۲۸۶۔

۹؎ طبقات ناصری، جلد اول، ص ۴۰۵۔

۱۰ء ایضاً ص ۱۷۱، نیز تاریخ فخر مدبر، مرتبہ ڈینیس راس، لندن، ۱۹۲۷ء، ص ۳۰ تا ۳۱۔

۱۱ء شہاب الدین العمری کی تالیف مسالک الابصار فی ممالک امصار کے ہندوستان سے متعلق دو ابواب کو خورشید احمد فارق نے تصحیح اور اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے تاریخ ہند پر نئی روشنی، کے نام سے شائع کیا۔ اس مقالہ میں حوالے اسی ترجمہ سے دیے گئے ہیں۔

۱۲ء سلطان محمد بن تغلق شاہ کے عہد (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) تک البَاری ترک سلاطین کی دلی جو کہ قطب مینار کے اردگرد آباد تھی اس کے علاوہ شہر نو (کیلوکھڑی کے نزدیک) آباد ہوا تھا جو کہ جمنا کے قریب واقع تھا۔ شہر نو سلطان معز الدین کیقباد (م ۱۲۹۰ء) اور سلطان جلال الدین خلجی (م ۱۲۹۶ء) کا دار الخلافہ تھا۔ شہر نو مکمل شہر سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں ہوا تھا۔ اس کے بعد سلطان علاء الدین خلجی (م ۱۳۱۶ء) نے سری میں نیا اور خوبصورت شہر تعمیر کیا اور اس کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ سلطان غیاث الدین تغلق شاہ (۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۵ء) نے اپنے لیے تغلق آباد تعمیر کیا جس کے کھنڈرات اس کی عظمت کا پتہ دے رہے ہیں۔ اس کے بیٹے محمد بن تغلق شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد تغلق آباد کے مقابل نیا دار الخلافہ عادل آباد جس کو جہاں پناہ بھی کہتے تھے تعمیر کیا۔ یہ پانچ شہر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ العمری نے وہ دیہات اور شہر پناہ کی بستیوں کو بھی شہروں کے مجموعہ میں شامل کر لیا ہے۔ کہ جو یا تو شہر پناہ کے اندر آ گئے تھے یا شہر پناہ کے باہر امراء، سوداگروں اور روساء کے محلات کے اردگرد آباد ہو گئی تھیں۔ ابن بطوطہ نے شہر پناہ کے باہر روساء کے محلات کا ذکر کیا ہے۔ سرا پور کوچہ میں سید ابوالحسن عبادی عراقی کا محل تھا جس میں رات ہونے اور شہر کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے ابن بطوطہ کو ٹھہرنا پڑا تھا۔ دیکھئے عجائب الاسفار، جلد دوم، ص ۲۱۹

۱۳ء تاریخ ہند پر نئی روشنی، مترجم خورشید احمد فارق، ص ص ۱۳ تا ۱۴۔

اسلامی معاشرت پر مولانا سید جلال الدین عمری کی ایک قیمتی اور اہم کتاب

مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں

صفحات : ۶۰ قیمت : ۶ روپیے

اس وقیع کتاب کا انگریزی ترجمہ MUSLIM WOMEN: ROLE AND RESPON-SIBILITIES کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انگریزی جاننے والے قارئین کے لیے ایک تحفہ۔ صفحات ۶۰، قیمت : ۲۰ روپیے

ملنے کا پتہ : مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲